نظیر اکبرآبادی: پیکر فکر وفن کا شاعر

ڈاکٹر محمد بہلول
492 پہلی منزل، گلی بہار والی،
چھتہ لعل میاں، دریا گنج، نئی دہلی۔110002

ملخص

نظیر اکبرآبادی کی حیثیت محض ایک عوامی شاعر کی نہیں بلکہ ایک مصلح کی بھی ہے۔ان کی شاعری حدیث دل اور حکایات گل وبلبل کے بجائے زندگی کے تلخ حقائق کا بیان ہے۔نظیر کے کلام کی یہی خصوصیت انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے انھوں نے دوسرے شعرا کی طرح نہ تو قصیدے لکھے نہ ہجویں بلکہ ہندوستانی زندگی اور عوام کی ترجمانی کی۔نظیر اکبرآبادی سے پہلے اور بعد میں بھی اردو شعرا نے عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے لیکن جس شدومد اور خاص توجہ سے نظیر نے عوامی مسائل اور ان کی زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں اس کی مثال کمیاب ہے۔ان سے قبل اردو شاعری بادشاہوں اور امیروں سے متعلق سمجھی جاتی تھی لیکن نظیر نے اسے عمومیت عطا کی۔زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر غور کیا، تنگ نظری اور کوتاہ بینی سے اوپر اٹھ کر حیات انسانی کے تمام گوشوں پر یکساں نظر ڈالی اور اسے عوام سے روشناس کرایا۔نظیر نے اکبرآباد میں رہتے ہوئے ایک حساس فنکار کی طرح پورے ہندوستان کی بربادی کا نظارہ پیش کیا ہے اور اس دلسوز منظر سے خود بھی متاثر ہوئے، میر وسودا کی طرح اس زمانے کی ترجمانی کے لیے انھوں نے شہر آشوب بھی لکھے لیکن صرف اہل نکبت وافلاس کی تصویر کشی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اخلاقی قدروں کے زوال کے موثر خاکے بھی پیش کیے۔

پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں کہ:

''بڑا فنکار وہ ہے جو اپنے سینے کی آگ کو نہ صرف مترنم لفظوں اور موثر بیان میں ڈھال سکے بلکہ اسے دوسروں کے سینوں میں بھی اسی طرح روشن کر سکے۔ انفرادی تجربوں سے انسانی وجود کی گرہیں کھولنا ہی آرٹ کا فریضہ ہے۔''[1]

پروفیسر محمد حسن کا یہ خیال بڑی حد تک نظیر اکبر آبادی کے کلام پر صادق آتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف مترنم لفظوں اور موثر بیان میں شاعری کی بلکہ اپنے سینے کی آگ کو شاعری کے پیکر میں اس طرح ڈھالا کہ دوسروں نے بھی اس گرمی کو محسوس کیا۔

نظیر اکبر آبادی سے پہلے اور بعد میں بھی اردو شعرا نے عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے لیکن جس شد و مد اور خاص توجہ سے نظیر نے عوامی مسائل اور ان کی زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں اس کی مثال کمیاب ہے۔ ان سے قبل اردو شاعری بادشاہوں اور امیروں سے متعلق سمجھی جاتی تھی لیکن نظیر نے اسے عمومیت عطا کی۔ زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر غور کیا، تنگ نظری اور کوتاہ بینی سے اوپر اٹھ کر حیات انسانی کے تمام گوشوں پر یکساں نظر ڈالی اور اسے عوام سے روشناس کرایا۔ بقول مخمور اکبر آبادی:

''کیا یہ طریقہ کار انسان پر احسان نہیں کہ نظیر نے شعر کی دولت سوسائٹی کے اس طبقہ تک پہنچا دی جو اب تک ہر اعتبار سے نا اہل سمجھا جاتا تھا اور اس میں سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ فیض سخن ایک بڑی مشہور بات ہے لیکن جس سخن سے صحیح معنی میں فیض پہنچا وہ نظیر ہی کا سخن ہے۔''[2]

نظیر اکبر آبادی کی حیثیت محض ایک عوامی شاعر کی نہیں بلکہ ایک مصلح کی بھی ہے۔ ان کی شاعری حدیث دل اور حکایات گل و بلبل کے بجائے زندگی کے تلخ حقائق کا بیان ہے۔ نظیر کے کلام کی یہی خصوصیت انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے انھوں نے دوسرے شعرا کی طرح نہ تو قصیدے لکھے نہ ہجویں بلکہ ہندوستانی زندگی اور عوام کی ترجمانی کی۔ ان کی شاعری بقول آل

احمد سرور ''عوام کی پکار'' ہے۔

نظیر نے اکبر آباد میں رہتے ہوئے ایک حساس فنکار کی طرح پورے ہندوستان کی بربادی کا نظارہ پیش کیا ہے اور اس دلسوز منظر سے خود بھی متاثر ہوئے، میر وسودا کی طرح اس زمانے کی ترجمانی کے لیے انھوں نے شہر آشوب بھی لکھے لیکن صرف اہل نکبت وافلاس کی تصویر کشی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اخلاقی قدروں کے زوال کے موثر خاکے بھی پیش کیے۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری چونکہ عوام کی زندگی سے عبارت ہے اس لیے ابتدا میں انھیں عوامی اور بازاری شاعر کہہ کر نظر انداز کرنے کی بھی کوشش کی گئی لیکن زمانہ خود بڑا منصف ہے۔ چنانچہ وہ وقت آیا کہ سنجیدہ فکر ونظر رکھنے والے نقادوں نے ان کے کلام کو سراہا اور نظیر کو عوامی شاعر کہنے کے بجائے آفاقی شاعر کا درجہ دیا۔ مجنوں گورکھپوری نے نظیر کی آفاقیت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''جس چیز کو ہم ابتذال بتاتے ہیں وہی نظیر کا فن ہے۔ یہ اصل میں دو عقیدوں اور دو معیاروں کا سوال ہے۔ عام طور سے ہم شاعری کو خواص کی دنیا کی چیز سمجھتے رہے ہیں اس لیے اس کے جتنے اصول واسالیب مرتب ہوئے وہ خواص کی معاشرت سے ماخوذ کیے گئے ہیں۔ نظیر کا عقیدہ اس کے برعکس تھا۔''[3]

نظیر اکبر آبادی کشادہ دل ودماغ رکھتے تھے۔ عوام وخاص کی کوئی تفریق ان کے یہاں نہ تھی۔ ہر طبقہ وعقیدہ اور تمام مذہب وملت کی ان کے نزدیک یکساں حیثیت تھی۔ سب کے ساتھ ہمدردی ومحبت رکھتے تھے کیونکہ وہ انسانیت کے پیغامبر تھے جہاں چھوٹے بڑے، ہندو مسلمان، امیر غریب جیسی کوئی معیار بندی نہیں ہوتی، بسا اوقات نظیر کو معاشرے میں امیر وغریب کی تفریق کا شدید احساس ہوا لیکن اس پر کبیدہ خاطر ودل گیر ہونے کے بجائے انھوں نے موقع ومحل کے مطابق ایسی نصیحت کی جو دیرپا اثر چھوڑ گئی۔ نظم ''شب برات'' سے دو بند دیکھیے:

دنیا کی دولتوں میں جو زر دار ہیں بڑے

قندوں کے حلوے، روغنی نانیں، نئے گھڑے
پہونچاتے خوان پھرتے ہیں نوکر کئی پڑے
زندے بھی راہ تکتے ہیں، مردے بھی ہیں کھڑے
ان خوبیوں کی رکھتی ہے تیاری شب برات

ٹھلیاں، چپاتی، حلوے کی تو سب میں چال ہے
ادنا غریب کے تئیں یہ بھی محال ہے
کالے سے گڑ کی لپٹی کڑھی کی مثال ہے
پانی کی ہانڈی، گیہوں کی روٹی بھی لال ہے
کرتی ہے ایسی دکھیا پسنہاری شب برات

مذکورہ بالا ان اشعار کا مقصد فقط شاعرانہ لطف نہیں بلکہ پند ونصیحت ہے کہ امرا کو عیش و آرام کے ساتھ ساتھ غریبوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے تا کہ اسلام کے فلسفہ خیرات وصدقات پر عمل ہو سکے اور غربا ومساکین بھی تقریبات سے محظوظ ہو سکیں۔

نظیر نے ''آدمی نامہ'' لکھ کر انسانی نابرابری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے ان کے نزدیک آدمی صرف آدمی ہے۔ ملکوتی اور شیطانی دونوں صفات بیک وقت اس کے اندر پائی جا سکتی ہیں۔ آدمی ہی حاجی ونمازی اور صائم ہوتا ہے، امام اور خطیب ہوتا ہے اور آدمی ہی سارق، کاذب، بدکار، لیکن انسان کی منزلت فقط انسان ہونے کی حیثیت سے بھی لازم ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس نظم ''آدمی نامہ'' میں نظیر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان انسان سب برابر ہیں رنگ ونسل، ادنیٰ واعلیٰ، مذہب وملت کے نام پر تفریق اور کشت وخون انسانیت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ ہر شخص آدمی ہونے کے سبب مساوی حقوق کا مستحق ہے۔ ''آدمی نامہ'' عوام دوستی اور انسانیت پرستی کا واضح ثبوت ہے، عظمت انساں کے سامنے اعلیٰ وادنیٰ کا فرق عبث ہے۔ نظیر نے خالص بیانیہ انداز میں سمجھانے کی سعی کی ہے کہ ''اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر'' بحیثیت انسان برابر ہیں اور یکساں احترام کے لائق ہیں۔

نظیر اکبرآبادی وسیع القلب اور خوش مزاج انسان تھے اس لیے سیر وتفریح کے بھی دلدادہ تھے بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے، ہر ایک سے خوش اخلاقی اور اخوت ومحبت سے پیش آتے، ہر ایک کی خوشی میں خوش اور غم میں مغموم غرض کہ عجیب خوبیوں کے مالک تھے اس لیے اگر انھیں قلندر صفت کہا جائے تو بجا ہے۔

نظیر کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی انھوں نے اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو قابل توجہ سمجھا، یہاں کے رسم ورواج، مذہبی عقاید ورسومات، تیوہار، شادی وغمی کی تقریبات، موسم، کوہ ودریا، چمن وصحرا وغیرہ ان کی شاعری کا موضوع بنے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو ان کی شاعری میں اپنی تصویر نظر آئی۔ اسی بنا پر عوام وخواص دونوں طبقوں میں ان کی شاعری نے شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ نیاز فتح پوری نے کلام نظیر کے تنوع کو سراہتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''نظیر کا کلیات ایک ایسا نایاب ذخیرہ ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو معیشت، معاشرت کا کوئی انداز اور احساسات وتاثرات کا کوئی ایسا منظر نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو۔ اور عالم محسوسات کی شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس کا ذکر کسی نہ کسی نہج سے نظیر نے نہ کیا ہو۔''[4]

عبادت بریلوی نے کلام نظیر کے تنوع کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''نظیر نے ہر جگہ عوامی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ ایسے عوامی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جن سے عوامی زندگی عبارت ہے۔ ان

کی خوشیاں، ان کے رنج وغم، ان کے جذبات، ان پر بیتی ہوئی کیفیات، ان کے تیوہار، ان کے آئے دن کی دلچسپیاں، ان کے خیالات ونظریات، اعتقادات وتوہمات، سب کے سب نظیر کی شاعری میں بے نقاب ملتے ہیں، نظیر اس اعتبار سے بہت بڑا شاعر ہے۔''[5]

مجنوں گورکھپوری نے نظیر کی وطن دوستی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''نظیر خالص ہندوستانی شاعر تھے۔ ہندوستان کی زندگی اور ہندوستان کے رسوم و روایات ان کی شاعری کے لازمی عناصر ہیں وہ اپنی گرد و پیش کی زندگی کے عام سے عام واقعات کے ساتھ سچی موانست رکھتے ہیں اور انھیں سے اپنی شاعری کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں۔ نظیر اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا کلام پڑھ کر ہندوستان کے حالات اور عام معاشرت اور یہاں کے رسم ورواج کے متعلق معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔''[6]

موضوعات کے تنوع کے علاوہ الفاظ کے انتخاب اور ان کے مناسب استعمال پر بھی نظیر کو خاص قدرت حاصل ہے۔ الفاظ کے مناسب دروبست سے ایک قسم کی موسیقیت وغنائیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ خوبی بہت کم شعرا کے یہاں پائی جاتی ہے۔ نظیر اپنی شاعری میں الفاظ کا برمحل استعمال کس طرح کرتے ہیں ایک منظر دیکھیے:

دکھا کر اک جھلک دل کو نہایت کر گیا بے کل
پری رو، تند خو، سرکش، ہٹیلا، چلبلا، چنچل
وہ عارض اور جبیں تاباں کہ ہوں دیکھ اس کو شرمندہ
قمر، خورشید، زہرہ، شمع، شعلہ، مشتری، مشعل
کفوں میں، انگلیوں میں، لعل لب میں، چشم مے گوں میں
حنا آفت، ستم خندق، مسی جادو، فسوں کا جل

یہاں نظیر نے الفاظ کا ایک دلکش میلہ لگا دیا ہے جو قاری کے لیے فردوس گوش اور جنت نگاہ

ہے۔نظم ''برسات'' بھی لفظی صنعت گری کی عمدہ مثال ہے۔

زور مزوں سے فرات کو بر سے تھا مینہ جھمک جھمک
بوندیں پڑی ٹپک ٹپک، پانی پڑے جھپک جھپک
جام رہے چھلک چھلک، شیشے رہے بھبک بھبک
یار بغل میں بانمک عیش و طرب تھے بے دھڑک
ہم بھی نشوں میں خوب چھک، لوٹتے تھے بہک بہک
کیا ہی سماں تھا عیش کا اتنے میں آہ یک بیک
ابر کھلا، ہوا گھٹی، بوندیں تھمیں سحر ہوئی
پہلو سے یار اٹھ گیا سب وہ بہار بہہ گئی

ابومحمد سحر نے نظیر کی اسی خوبی کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اگر ہم نظیر اکبرآبادی کی انسان دوستی اور درویش منشی کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیں تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ مشاہدہ، ظرافت اور ذخیرہ الفاظ کے شاعر تھے۔''[7]

نظیر الفاظ کے مزاج شناس تھے انھوں نے الفاظ کو اس ترتیب وسلیقے سے استعمال کیا ہے کہ ان کی نظمیں الفاظ کا خزانہ معلوم ہوتی ہیں۔نظیر اکبرآبادی نے اپنی شاعری میں قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کو بھی ایک خاص اہمیت دی ہے۔انھوں نے رنگ ونسل، مذہب وملت، قوم وقبیلہ جیسی تفریق کو مہمل قرار دیا ہے اور تمام لوگوں کو ایک ساتھ مل کر رہنے اور ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کی تعظیم کی تلقین کی ہے۔خود زندگی بھر وہ انھیں اصولوں پر کاربند رہے۔نظیر کی شاعری بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کی بہترین مثال ہے ان کے نزدیک جو شے قابل احترام ہے وہ انسانیت ہے۔باہمی تفرقے اور تنازع عبث و بے کار ہیں اور ''مذہب نہیں سکھا تا آپس میں بیر رکھنا'' نظیر کا پیغام ہے۔

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں

جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنّار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں
عاشق تو قلندر ہے نہ ہندو نہ مسلماں
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیر کی شاعری میں اس طرح کی مثالیں بھری پڑی ہیں جو ہندو مسلمان کو بھائی چارگی اور محبت و ہمدردی کا پیغام دیتی ہیں خود ان کی زندگی اسی کی ترویج و اشاعت میں گذری اور ہمیشہ بہ زبان حافظ یہ پیغام دیتے رہے۔

حافظ اگر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام

مخمور اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ:

''نظیر کے اخلاق کا سب سے تاباں جوہر ان کی بے تعصبی ہے، اگر وہ کسی جگہ اسلامی معاشرت کے کسی صیغہ پر روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری جگہ فوراً ہی ہندو سوسائٹی کے ہم رتبہ و ہم رنگ شعبے کا تذکرہ اسی حیثیت سے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں مثلاً ایک مصرع میں مسجد کا ذکر ہے تو دوسرے میں مندر کا ذکر لازمی ہے۔''[8]

اختر اورینوی نے بے تعصبی اور رواداری کو نظیر کی شاعری کا جزو لاینفک قرار دیا ہے:

''نظیر کے دل کا گداز اور اس کی حقیقت آگاہی اسے رواداری اور محبت سکھاتی ہے اس کی رواداری اتنی وسیع تھی کہ وہ انسانی غلطیوں سے بھی مسکراتا ہوا چشم پوشی کر لیتا تھا۔ ایک حقیقت آگاہ (Realist) اور واقعیت پسند شخص کبھی بھی متعصب نہیں ہوسکتا۔''[9]

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جہاں مسلم تیوہاروں کا ذکر کیا ہے وہیں ہولی اور دیوالی کے

موضوع پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ مشاہیر اسلام کے ساتھ ساتھ کرشن کنہیا، مہادیو جی اور بعض دوسری ہستیوں پر نظمیں ان کی اسی مذہبی رواداری کو نمایاں کرتی ہیں۔ ان کی بے تعصبی کا اندازہ ان کی حمدیہ نظموں سے بھی ہوتا ہے عام طور پر حمدیہ نظمیں خدائے واحد یا کسی ایک مذہب اور عقیدے سے متعلق ہوتی ہیں لیکن ان کی حمد کا انداز ایسا عمومی اور ہمہ جہت ہوتا ہے کہ کسی بھی مذہب میں خدا کے تصور پر صادق آتا ہے۔

کوئی خالق، باری، رب، مولا، رحمٰن، اللہ، تنگری
کوئی الکھ روپ کرتار کہے، نرکال، نرنجن، گردھاری
کوئی رام رام کہہ کر سمرے، کوئی بولے شیو شیو ہری ہری
کوئی دانو، دنیت، دیواٹل، کوئی راچھس، دیوت، جن، پری
کل عالم تیری یاد کرے، تو صاحب سب کا سچا ہے

نظیر اکبرآبادی کی یہ حمد عالمی بھائی چارگی کی عمدہ مثال ہے اور مذہبی تفریق کے طلسم کو توڑتی ہے۔ وہ خود اس بات کے قائل تھے کہ عبادت و بندگی کے لائق صرف ذات واحد ہے فرق صرف تعبیرات کا ہے۔

سجاد باقر رضوی نظیر کے مذہب کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''نظیر نظر کے شاعر تھے، نظریات کے گھیرے میں نہ آسکے۔'' 10

الغرض نظیر کی پوری شاعری رواداری، بے تعصبی، اخوت و محبت کی عمدہ مثال ہے جس سے قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کے تصور کو فروغ ملتا ہے۔

نظیر نے اپنی نظموں میں جزئیات نگاری سے بھی خوب کام لیا ہے انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا، نظیر نے سماجی و معاشرتی زندگی کی ایسی تصویر پیش کی جو تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ان کا مشاہدہ اتنا وسیع و جامع ہے کہ کوہ سے لے کر کاہ تک کی کوئی چیز ان کی نگاہ سے نہیں بچتی، جب کسی منظر کی تصویر کشی کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک ذرے کا

حساب لے رہے ہیں۔نظم ''سمدھن''، ''برسات''، ''آگرے کی پیرا کی''، ''بھونچال''، ''کبوتر باری'' اور ''پھسلن'' وغیرہ مرقع نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔''سمدھن'' سے ایک بند ملاحظہ ہوں ۔

کھنچی کنگھی، گندھی چوٹی، جمی پٹی،، لگا کاجل
کماں ابرو، نظر جادو، نگہ ہر اک دلاری ہے
جبیں مہ تاب، آنکھیں شوخ، شیریں لب، گہر دنداں
بدن موتی، دہن غنچہ، ادا ہنسنے کی پیاری ہے
لٹکتی چال مدھ ماتی، چلے بچھوؤں کو جھنکارتی
ادا میں دل لیے جاتی، عجب سمدھن ہماری ہے

وحیدالدین سلیم نظیر کی مرقع نگاری کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نظیر اکبر آبادی نے عام لوگوں کے میلوں ٹھیلوں اور ان کے حالات و خیالات اور مشاغل زندگی کی ایسی سچی اور صحیح تصویریں کھینچی ہیں کہ کوئی شاعر اس کا مقابلہ اس باب میں نہیں کرسکتا۔''[11]

نظیر کی پوری شاعری مرقع نگاری کی عمدہ مثال ہے جس منظر کا نقشہ کھینچا ہے اسے زندہ جاوید بنادیا ہے۔ برسات کا ایک منظر دیکھیے :

اور جس صنم کے تن میں جوڑا ہے زعفرانی
گلنار یا گلابی یا زرد سرخ دھانی
کچھ حسن کی چڑھائی اور کچھ نئی جوانی
جھولوں میں جھولتی ہیں اور پڑے ہے پانی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اس سے قبل اور بعد کے بھی دو بند اسی طرح حسین اور دلفریب ہیں یہاں شاعرانہ رنگ غالب اور جوانی کی سرشاری و مستی اپنے آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہے اس کے علاوہ ''آگرے کی تیراکی'' میں مقامی رنگ کی چھاپ جھلکتی ہے۔ چونکہ نظیر نے آگرے کی تیراکی میں خود

بھی حصہلیا تھا۔ وہاں کے جملہ رسوم ورواج میں شرکت کی تھی، ہولی میں ہولی کھیلی، مہادیو جی کے میلے کا منظر دیکھا اور جو اثرات مرتب ہوئے اسے شاعری کا جامہ پہنا دیا۔ نظیر ان تجربات کی یاد سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ''آگرے کی پیراکی'' کا منظر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

جب پیر نے کی رت میں دلدار پیرتے ہیں
عاشق بھی ساتھ ان کے غم خوار پیرتے ہیں
بھولے، سیانے، نادان، ہشیار پیرتے ہیں
پیر و جوان، لڑکے، عیار پیرتے ہیں
ادنیٰ، غریب، مفلس، زردار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

یہ پوری نظم بڑی دلکش ہے، ہر مصرعہ نہایت پر کیف، مسرت بخش اور بے ساختہ ہے۔ زبان صاف وستھری ہے۔ نظیر کی حقیقت نگاری اور مصوری کا اعتراف کلیم الدین احمد نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''نظیر حقیقت طراز شاعر ہیں جو چیزیں وہ گردوپیش میں دیکھتے ہیں ان کی جیتی جاگتی تصویریں اتارتے ہیں۔''12

نظیر کی مرقع نگاری ایک آرٹ گیلری کا درجہ رکھتی ہے جہاں رنگ برنگی تصویریں آویزاں ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ:

''نظیر کی شعری کائنات میں بڑی وسعت ہے۔ کبوتر بازی، گلہری کے بچے، اسی طرح ''آگرے کی پیراکی'' اور ''نرجلا پتنگ کے میلے'' پر بھی ان کی نظمیں ہیں۔ شمالی ہندوستان کے موسموں کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جس کا ذکر انھوں نے نہ کیا ہو اور جس سے وہ جی بھر کر لطف اندوز نہ ہوئے ہوں۔''13

نظیر نے جانوروں، پرندوں اور موسموں سے متعلق جو نظمیں لکھی ہیں مثلاً ریچھ کا بچہ،

اژدہے کا بچہ، گلہری کا بچہ، کبوتر بازی، جاڑا، برسات وغیرہ ان سب میں جزئیات کا خاص خیال رکھا ہے۔ کبوتروں کی جتنی اقسام انھوں نے گنائی ہیں شاید ہی کسی کبوتر باز کو آج یاد ہوں۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے کلام نظیر کی اس خوبی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''ان کی (نظیر اکبرآبادی) نظمیں جانوروں کے متعلق مثلاً ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ، جنگل کے جانوروں میں ہرن کا بچہ، بلبلوں کی لڑائی وغیرہ اس قدر دلچسپ ہیں اور اس قدر جزئیات سے مملو ہیں کہ پڑھنے والے کو ان کی تمام واقفیت اور ہمہ دانی پر تعجب ہوتا ہے۔''[14]

ارسطو کے نزدیک محاکات شاعری کا اہم جزو ہے مولانا شبلی نے بھی اسے شاعری کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ نظیر کی شاعری میں ہمیں محاکات نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔

مولانا عبدالباری آسی نے اس خوبی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''دنیا میں ہزاروں رسوم ہیں جو ہر تیوہار اور ہر شادی وغم کے موقع پر برتی جاتی ہیں مگر ان کے جزئیات کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ مگر نظیر کو دیکھیے کہ وہ بغیر اس کے کسی چیز پر نگاہ ڈالتا ہی نہیں۔''[15]

جزئیات نگاری کے لیے لفظی در و بست اور صوتی آہنگ بہت ضروری ہے جب تک شاعر اس آہنگ کا مزاج داں نہ ہوگا اچھی مصوری نہیں کر سکتا۔ نظیر الفاظ کے مزاج شناس تھے ان کو الفاظ کے استعمال کا سلیقہ بھی تھا۔ ایک مثال دیکھیے:

کتنے شراب پی کر ہو مست چھک رہے ہیں
مے کی گلابی آگے، پیالے چھلک رہے ہیں
ہوتا ہے ناچ گھر گھر، گھنگرو جھنک رہے ہیں
پڑتا منھ جھڑا جھڑ، طبلے کھڑک رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

نظم ''چاندنی'' کا یہ بند بھی قابل دید ہے۔

جس چمن میں چاند کی ہوں خوش جمالیاں

اور جھومتی ہوں باغ میں پھولوں کی ڈالیاں
بہتی ہوں مے کے جوش سے عشرت کی نالیاں
کانوں میں نازنیں کے جھمکتی ہوں بالیاں
عیش و طرب کی دھوم،نشوں کی بحالیاں
جب چاندنی کی دیکھیے راتیں اجالیاں

نظیر کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ پر آشوب دور میں زندگی بسر کرنے کے باوجود انھوں نے رجائیت کے نغمے گائے۔ وہ خود بھی زندگی سے لطف اندوز ہوئے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ تیوہاروں، میلوں ٹھیلوں کے علاوہ آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، موت وغیرہ جیسی نظمیں بھی یاس و نا امیدی کے بجائے زندگی جینے کا حوصلہ بخشتی ہیں۔

نظیر کی شاعری میں زندگی کا ایک پائیدار اور ٹھوس تصور ہے ان کی شاعری زندگی جینے اور مصائب و آلام کو ہنسی خوشی برداشت کرنے کا درس دیتی ہے اگر ان کی شاعری کو رجائیت کا اعلان نامہ کہا جائے تو بجا ہے۔

مشہور مستشرق ڈبلیو ایس، فین نے ''نئی ہندوستانی انگریزی ڈکشنری'' کے دیباچہ میں نظیر کی شاعرانہ خصوصیات کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی رجائیت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

> ''نظیر کو فطرت کے ہر منظر اور انسانیت کے ہر رخ سے محبت تھی۔ وہ ہر چیز میں خیر کا پہلو دیکھتا تھا۔ وہ عوام کے ساتھ ہنستا، قہقہے لگاتا اور ٹھٹے مارتا ہے۔ وہ ان کے کھیلوں اور تفریحوں سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ ان کے درد کو محسوس کرتا ہے۔''[16]

نظیر کی حسن پرستی اور لطف اندوزی ان کے جذبہ رجائیت کی مظہر ہے۔ ہولی، دیوالی، راکھی کے تیوہار اور حسن و عشق کے معاملات میں اس پہلو کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے اور اس سے زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھا جا سکتا ہے۔

مخمور اکبر آبادی کا یہ خیال نظیر کے جذبہ رجائیت کا ترجمان ہے:

''زندگی کے قیمتی لمحوں کو ماضی کے تاسف میں صرف کرنا زندگی کی صلاحیت سے محروم ہوجاتا ہے۔''[17]

نظیر کی شاعری مقصد حیات سے عبارت ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کو مصائب وآلام سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ ایسے اوقات میں رویہ تو یہ ہونا چاہیے کہ ''مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں''

مجنوں گورکھپوری نے نظیر کے رجائی پہلو کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''نظیر کے کلام کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خوش دل اور شگفتہ مزاج رفیق مل گیا ہے جس کو انسان اور انسانی دنیا سے محبت ہے جو انسانوں کی بے قدری نہیں کرتا۔ جو انسانی زندگی کی کم مائیگی کا احساس پیدا کر کے دلوں کو افسردہ نہیں کرتا، جو اپنی رفاقت سے ہمارے اندر ایک تقویت پیدا کرتا ہے اور ہم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ زندگی صرف دکھ درد کا نام نہیں ہے، ہنسی خوشی بھی زندگی ہی کی باتیں ہیں۔ یہاں کانٹے بھی ہیں، پھول بھی ہیں۔ کانٹوں کو نظر میں رکھو اور پھولوں سے دل خوش کرو۔''[18]

نیاز فتح پوری نے نظیر کی رجائیت کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''نظیر ایک چٹکلے باز شاعر تھا ''چٹکلے باز'' ہماری سوسائٹی کا وہ انسان ہے جو بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، غریبوں سے لے کر امیروں تک ہر عمر وطبقہ کی محفل میں اپنی جگہ پیدا کر لیتا ہے جو کبھی ''بار خاطر'' نہیں بلکہ ہمیشہ ''یار شاطر'' ثابت ہوتا ہے اور جس کی ہستی تکلف وتصنع سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ یہ اس کی زندگی کا رجائی (Optimistic) پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے اور خود وہ ہنسے یا نہ ہنسے لیکن دوسروں کو ہنسانے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔''[19]

نظیر کی شاعری کا ایک خاص پہلو ان کی تمثیل نگاری ہے۔ نصیحت وموعظت کے دو طریقے ہوتے ہیں بلا واسطہ اور بالواسطہ یعنی براہ راست کوئی بات نہ کہہ کر استعارے کے پردے میں کہی جائے تا کہ زود اثر ہو، آہستہ آہستہ اس طریقے نے تمثیل کی شکل اختیار کر لی۔ ابتدا میں اس کا مقصد

خام ذہنوں کی علمی اور اخلاقی تربیت تھی لیکن بعد میں شعرا نے اس سے خوب کام لیا اور یہ شاعری کی زینت بنی۔

تمثیل کے سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند کا خیال ملاحظہ ہو:

''تمثیل کے کردار دراصل کسی دوسرے کردار کے نمائندے ہوتے ہیں ان سے وہ مراد نہیں جو ظاہراً نظر آتا ہے بلکہ ان کے نیچے موج تہہ نشیں کی طرح کچھ اور معنی چھپے ہوتے ہیں اس طرح تمثیل استعاروں کی ایک زنجیر ہوتی ہے۔ تمثیل اور استعارے میں خاص فرق یہ ہے کہ استعارہ ایک شعر یا جملے میں ہوتا ہے جب کہ تمثیل کہیں زیادہ مفصل ہوتی ہے۔''[20]

نظیر کی بیشتر نظمیں معنی خیز اور فکر انگیز تمثیلیں ہیں ''ہنس نامہ'' تمثیل کی عمدہ ترین مثال ہے اس نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی عارضی و فانی ہے اور یہ کہ انسان کو اس دنیا سے تنہا سفر کرنا ہے کوئی مونس و رفیق ساتھ نہ دے گا لہٰذا انسان کو دولت و شہرت سے مغلوب ہو کر اپنی حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے۔ اس نظم کی ظاہری خوبی بھی قابل توجہ ہے کیونکہ اس میں پرندوں کے نام کثرت سے استعمال ہوئے ہیں ایک نظم میں اتنے ناموں کا اکٹھا ہو جانا عظیم فنکار کی دلیل ہے۔

مولانا عبدالباری آسی نے لکھا ہے کہ:

''نظیر کا ''ہنس نامہ'' آج تک زندہ و مقبول ہے، یہ معنوی اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجہ کی حکیمانہ تمثیل ہے اور ظاہری خوبی میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ جتنے پرندوں کے نام اس نظم میں جمع کر دیے ہیں اردو کی کسی اور نظم میں ایک ساتھ نہیں مل سکتے۔''[21]

نظیر نے اس نظم میں تمثیل کے ذریعہ حکیمانہ اور ناصحانہ باتیں پیش کی ہیں جس کا مقصد اصلاحی و اخلاقی ہے۔ ''ہنس نامہ'' کا آخری بند پوری نظم کا ماحصل ہے۔ پرندوں کی درماندگی اور بے چارگی جو انسانی عاجزی کے مترادف ہے اور بقول گیان چند جین:

''اس دنیا میں انسان کے درد اور رخصت کی بڑی حسین تمثیل ہے۔''[22]

دنیا کی جو الفت ہے تو اس کی ہے یہ کچھ راہ
جب مشکل یہ ہووے تو بھلا کیونکہ ہو نر باہ
ناچاری ہو جس جا تو وہاں کیجیے کیا چاہ
سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

''ہنس نامہ'' نظیر کے آیات کمالات میں سے ہے اس کے علاوہ بھی بہت سی نظمیں خصوصاً ''بنجارہ نامہ'' اور ''موت'' وغیرہ تمثیل کی عمدہ مثالیں ہیں۔

رام بابو سکسینہ نے اس خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان کی (نظیر اکبر آبادی) تمثیلیں بہت دلکش ہوتی ہیں۔ ان کی نظم ''موت'' اور ''بنجارہ نامہ'' مغرور اور سرکش لوگوں کے لیے تازیانہ عبرت ہے۔''[23]

نظیر کے یہاں ایسی نظموں کی کثرت ہے جن میں خاص حکیمانہ، فلسفیانہ اور متصوفانہ خیالات نظم ہوئے ہیں انھوں نے زندگی اور کائنات کے ہر پہلو کو بہت قریب سے دیکھا اور دلچسپ نتائج اخذ کیے مثلاً زندگی ناپائیدار ہے، دنیا بے ثبات ہے، موت سے مفر نہیں، دنیا سے تنہا ہی جانا ہے اور دوست واحباب سب ساتھ چھوڑ دیں گے وغیرہ۔ نظم ''بنجارہ نامہ'' سے ایک بند ملاحظہ ہو ؎

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
وہی پوت، جنوائی، بٹیا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

مولانا عبدالباری آسی نے اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''بنجارہ نامہ'' نظیر کی مقبول ترین نظم ہے۔ یہ نہایت اعلیٰ درجہ کی ناصحانہ نظم

ہے جس میں بنجاروں کی خانہ بدوش زندگی سے انسان کی حباب آسا زندگی کی مماثلت دکھائی ہے۔''24

نظیر نے وحدۃ الوجود کے علاوہ معرفت الٰہی اور معرفت الٰہی کے لیے معرفت نفس ضروری قرار دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ دنیا دار فانی اور دار المکافات ہے لہٰذا یہاں کی نیرنگی سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔لیکن نظیر موت کے تصور سے محرومی و ناکامی کا نقش نہیں بٹھاتے بلکہ دردمندی اور عبرت کے تاثرات ابھار کر بہتر انسان بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔

نظیر کے کلام میں نشاطیہ عنصر کے ساتھ ساتھ طنز وظرافت کی بھی فراوانی ہے بہت سی نظمیں طنز وظرافت کی عمدہ مثال ہیں۔لیکن ان کے یہاں طنز کا مقصد معاشرے کی بے راہ روی کی اصلاح ہے کسی کا دل دکھانا مقصود نہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے طنز ومزاح کے سلسلہ پر ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

''طنز ومزاح میں گہرا تعلق ہے۔طنز کا ایک مقصد ہوتا ہے یہ زخم لگا کر اصلاح کرنا جانتی ہے،مزاح صرف تضادات،عجائبات،قول وفعل کے فرق،ظاہر وباطن میں بھید کی طرف اشارہ کر کے ناگوار کو گوارا اور نشیب وفراز کو ہموار کرنا سکھاتا ہے۔طنز کی تلوار کے بجائے مزاح کا نشتر زیادہ لطیف ہے اور اس نشتر کی کھٹک زندگی سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ اور ایک طور پر جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔''25

اس قول کی روشنی میں نظم ''شب برات'' کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

مُلا جو دینے فاتحہ گھر گھر میں جاتے ہیں
حلوا کہیں، کہیں وہ چپاتی اڑاتے ہیں
مفلس کوئی بلاوے تو منہ کو چھپاتے ہیں
شکر کا حلوہ سنتے ہی بس دوڑے جاتے ہیں
کہتے ہوئے یہ دل میں اہا ہاری شب برات

نظیر کے طنزیہ کلام کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا تو خود ان کی ذات سے متعلق ہے اور دوسرے کا تعلق سماج سے ہے۔ ''آدمی نامہ''، ''دنیائے دوں کے تماشے'' وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نظیر کی اس خصوصیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''نظیر کی شاعری کو صرف اس اجتماعی شعور کی بنا پر اہمیت حاصل نہیں۔ اس کی اہمیت کی ایک اور وجہ اس کا مزاحیہ و طنزیہ لہجہ اور مسرت و بہجت کا اظہار بھی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ نظیر اردو کے وہ پہلے شاعر تھے جنھوں نے نہ صرف شعر کو جیتے جاگتے ماحول سے قریب تر لانے کی سعی کی بلکہ جو ہجو کی محدود کینہ پروری سے نکل کر طنز و مزاح کے وسیع اطلاق کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔''[26]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آزاد منش نے ملک کی ہر چیز اور معاشرے و سماج کی ہر اچھی بری بات کو موضوع سخن بنایا۔ ایک طرف تہواروں، میلوں ٹھیلوں اور تقریبات کا ذکر ہے تو دوسری طرف صوفیانہ زندگی کے اسرار و رموز کی تہہ داریوں، درویشانہ اور فقیرانہ زندگی کی کلفتوں اور مصیبتوں کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی رعنائیوں اور دلفریبیوں کا بھی، صنعت و حرفت اور موسموں کے دلفریب منظر کا نقشہ نیز از طفلی و جوانی تا شیب و بڑھاپا کے سفر کی داستان بھی الغرض ہر شعبہ حیات ان کی توجہ کا مرکز رہا یہی اس کا فن اور زندگی کے تمام پہلوؤں پر دسترس ان کا کمال ہے۔

حواشی

1 ادبی تنقید، پروفیسر محمد حسن، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ص 20، جولائی 1954
2 نظیر پر ایک نظر، مخمور اکبر آبادی، ص 74، نظیر نامہ، مرتبہ شمس الحق عثمانی، صبوحی پبلی کیشنز، دہلی 1979
3 ادب اور زندگی، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ص 302، اردو گھر، علی گڑھ، 1964
4 نظیر میری نظر میں، پروفیسر نیاز فتح پوری، ص 87، نظیر نامہ، مرتبہ شمس الحق عثمانی، صبوحی پبلی کیشنز، دہلی 1979
5 نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر طلعت حسین، ص 344، فروری 1990
6 ادب اور زندگی، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ص 288، اردو گھر، علی گڑھ 1964
7 اصول تحقیق و تنقید، ڈاکٹر ابو محمد سحر، ص 30، مکتبہ ادب، مالویہ نگر، بھوپال، اکتوبر 2002

8 روح نظیر، مخمور اکبر آبادی، ص19، گیا پرشاد اینڈ سنس، آگرہ 1946
9 نظیر اکبر آبادی ایک عمومی تبصرہ، ڈاکٹر اختر اورینوی، ص71-70، نگار، نظیر نمبر، جنوری 1940
10 نظیر اکبر آبادی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ص 317، نظیر نامہ، مرتبہ شمس الحق عثمانی، صبوحی پبلی کیشنز، دہلی 1979
11 نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر طلعت حسین، ص334، فروری 1990
12 اردو شاعری پر ایک نظر (ضمیمہ نظیر اکبر آبادی)، پروفیسر کلیم الدین احمد، ص478، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ 1985
13 تہذیبی دید باز: نظیر، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص346، نظیر نامہ، مرتبہ شمس الحق عثمانی، صبوحی پبلی کیشنز، دہلی 1979
14 تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ص342، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، (ب ت)
15 نظیر کی جزئیات نگاری و زبان دانی، مولانا عبدالباری آسی، ص108، ماہنامہ 'نگار' نظیر نمبر، جنوری 1940
16 نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر طلعت حسین، ص398، فروری 1990
17 نظیر نامہ، مخمور اکبر آبادی، ص246، مشہور آفسیٹ پریس کراچی، پاکستان 1979
18 ادب اور زندگی، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ص287، اردو گھر، علی گڑھ، 1964
19 نظیر میری نظر میں، پروفیسر نیاز فتح پوری، ص3، ماہنامہ نگار، نظیر نمبر، لکھنؤ، جنوری 1940
20 اردو میں تمثیل نگاری، ڈاکٹر گیان چند جین، ص117، سالنامہ، نگار، پاکستان، 1966
21 کلیات نظیر اکبر آبادی، مولانا عبدالباری آسی، ص100، رام کمار پریس، لکھنؤ، 1951
22 اردو میں تمثیل نگاری، ڈاکٹر گیان چند جین، ص122، سالنامہ، نگار، پاکستان، 1966
23 تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ص341، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ (ب ت)
24 کلیات نظیر اکبر آبادی، مولانا عبدالباری آسی، ص98، رام کمار پریس، لکھنؤ 1951
25 اردو میں طنز و مزاح، آل احمد سرور، سہ ماہی، ادیب، علی گڑھ 1984
26 اردو ادب میں طنز و مزاح، اکادمی، پنجاب ٹرسٹ، لاہور، ص85، مارچ 1958